عبدل دہلوی کا ابراہیم نامہ

ریاست کرناٹک کو سارے بھارت میں یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اردو زبان و ادب کو عوامی سطح سے اٹھا کر بلند و بالا مرتبہ پر پہنچایا۔ دکن کے سلاطین نے اسے اپنے درباروں میں جگہ دی۔ اور اس زبان کو سرکاری اور ادبی زبان بنایا، اپنی سرپرستی سے نوازا۔ اس کی مثالیں گولکنڈہ اور بیجاپور کے دور میں ملتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں ادبی مراکز بن کر ابھرے۔ یہاں کے سلاطین وقت کے علاوہ بے شمار ادباء و شعراء و صوفیاء نے دکنی ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ گولکنڈہ میں وجہی نے قطب مشتری (مثنوی) اور سب رس (نثر) تصنیف کر کے دکنی ادب کے پہلے ادبی نقوش چھوڑے، بیجاپور میں اسی دور میں عبدل نے اپنے دور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو مصنف 'کتاب نورس' کی مدح میں قصیدہ 'ابراہیم نامہ' تصنیف کیا، جو بیجاپور کی پہلی ادبی تصنیف تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عبدل کو اس زبان میں شاعری کرنے میں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہ دہلی کا رہنے والا تھا، دوسرا یہ کہ اس کے سامنے اس زبان کے فن پارہ کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ دکنی ادب کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال کی تصنیف اور شہرت نے بیجاپور کے اسلوب کو بہت بعد کو بدلا، لیکن اس سے قبل بیجاپوری اسلوب کو قائم کرنے میں عبدل کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اس کا مرتبِ ابراہیم نامہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے بڑی تحقیق اور تخیل سے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ ایک نئی زبان میں شاعر کو جس کی اپنی مادری زبان نہیں ہے شاعری کرنے اور اس کو ایک ادبی کارنامے کے طور پر پیش کرنے میں کیا دقت پیش آئی ہوگی، اہل نظر اس کا تخیل کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف قصیدہ گوئی سے کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ہی لفاظی اور مبالغہ آمیزی ہی کام آسکتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ وقت نہ صرف بادشاہ ہے بلکہ اپنے وقت کا ماہر موسیقی شاعر بھی ہے۔ اور اس کی تعریف کر کے اس سے داد حاصل کرنا بے شک عبدل کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے باوجود عبدل نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور بہت کامیاب طریقے سے نہ صرف اپنے ممدوح کی مدح کی بلکہ اس زمانے کے بیجاپور اور اس کی طرز معاشرت کی صحیح تصویر، دستاویز کی حیثیت سے قلم بند کر دی۔ اگرچہ کہ آج بیجاپور میں اس دور کی بیشتر چیزیں کھنڈرات کی شکل میں موجود ہیں اور ہر ناظر کو دعوت نظارہ دینے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس دور میں اس شہر کی شان و شوکت اور عظمت کیا تھی اور ان کے مکین کس طرح کی بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے۔ آج ہم اکیسویں صدی میں ان کھنڈرات کی شان و شوکت اور عظمت سے مرعوب نظر آتے ہیں تو اس دور میں عبدل نے جوان ساری چیزوں کو اپنے عروج کے وقت دیکھا اور اسے اپنے شاعرانہ شعور، نادر تشبیہات اور تلمیحات کے ساتھ بیان کیا ہے اس دور کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، اور اصلی تاریخ بیجاپور بھی۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس مثنوی کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور بہت تحقیق کے بعد اس کی تدوین و ترتیب میں جو محققانہ قدم اٹھایا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ آپ محقق بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی۔ لسانیات کی مدد سے قدیم الفاظ کی صحیح قراۃ کے بعد اس کے صحیح نتائج برآمد کئے ہیں جس کا ثبوت ان کا طویل مقدمہ ہے۔ اس کی مثال عبدل کے لفظ کی تحقیق ہے۔ مثلاً دیگر محققوں نے عبدلا لکیتی کے لفظ سے اس کے نام کا قیاس عبدل الغنی کیا آپ نے اس لفظ کو غلط ثابت کیا اور بتایا کہ اس کو الگ کر کے پڑھنے سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا جو آپ کہہ رہے ہیں

تو عبدل کیتی صفت شہ کر بیاں
رہے ہو بھر کر زمیں آسماں
(اے عبدل! تو شاہ کی صفت کتنی ہی بیان کیوں نہ کرے وہ تو سارے آسمان اور زمین میں بھر رہی ہے)

اس شعر کے پس منظر میں آپ نے اس کا نام عبدل اخذ کیا ہے۔ جو منطقی طور پر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ داخلی شہادتوں کی بنیاد پر اس کی شخصیت کے چند پہلو بھی اجاگر کئے ہیں، اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ عبدل یا عبداللہ علوم متداولہ اور فن شعر و موسیقی کے کامل معلومات رکھتا تھا۔ وہ بیجاپور کی عظمت، اس کی شان و شوکت کا احساس رکھتا تھا اور دیگر شعراء کی طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی سرپرستی اور استادی کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

جن شاعروں کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوتی وہ اپنی تصنیف میں بادشاہ وقت کی تعریف و توصیف میں ایک باب ہی اس کے لئے وقف کیا کرتے اور یہ خصوصیت قدیم مثنویوں میں ملتی ہے۔ ابراہیم نامہ چونکہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا قصیدہ ہے مثنوی کی شکل میں ہے۔ اس صنف سخن میں شاعر کو یہ موقع فراہم ہوتا ہے کہ

وہ بزمیہ یا رزمیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ عبدل نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے ممدوح کی قلمی تصویر ایسی کھینچی کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مصوروں نے بھی رنگ و روغن کے ساتھ اس کی تصویریں بنائی ہیں جو عبدل کی قلمی تصویر سے بہت قریب ہے۔ صرف عبدل کے شاعرانہ بیان کو ہی سامنے رکھا جائے تو واقعی اس کے بیان میں مبالغہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے ہم عصروں نے اپنی تخلیقات میں ابراہیم عادل شاہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ عبدل کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں اور عبدل کی بات کا یقین ہوتا ہے۔

سن تصنیف: ۔

بچن پھول گوندیوں ابراہیم نام
کیا سیس پر برس بارہ تمام

سنہ۱۰۱۲شہور مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۰۲۰ھ پہ ختم ہوتا ہے۔ ۲۴ مئی سنہ۱۶۱۲ء مطابق ۳ ربیع الثانی سنہ۱۰۲۱ھ (مرتب مثنوی ص ۵۲۔۵۳ فٹ نوٹ)۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف جگت گرو (۹۸۸۔۱۰۳۷ھ مطابق ۱۵۸۰۔۱۶۲۷) جسے عبدل شہ ابراہیم، شاہ استاد، شاہ نورس، شاہ عالم، عالم پناہ، شہ دکن اور جگت گرو کے نام اور القاب سے یاد کرتا ہے چھ سال کی عمر میں چچا کے انتقال پر ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تربیت احمد نگر کی شہزادی، علی عادل شاہ کی بیوی چاند بی بی کے زیر نگرانی ہوئی۔ ابتدائی دس گیارہ سال اس کو بڑی کٹھنائیوں میں گذارنے پڑے۔ دلاور خاں کے زوال کے بعد ابراہیم کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ڈور آئی تو اس نے سلطنت کو استحکام بخشا پھر اس نے ساری توجہ علوم و فنون کی ترقی کی طرف مبذول کر دی۔ اور بیجاپور کو ودیا پور بنایا۔ اور یہاں فنون لطیفہ کے ماہروں کو جمع کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند کے گرد روشن ستارے جمع ہو چکے ہیں۔ اب ذرا عبدل کی زبان میں ابراہیم کا حلیہ دیکھئے

یوں شہ روپ کی سن کہانی تمام
نہ رہ کر سکیا مصر یوسف تمام
کہ مجھ روپ تھے ہوا دھک شہ دکھن
کلا روپ بھر کر سو چوسٹھ لکھن
بھولی مجھ حسن ایک زلیخا مدام
سو شہ دیکھ کر بھول عالم تمام

کندن شاہ کا رنگ ہو ذات بھر
ہر ایک ٹھاؤں پر رتن مل جوت دھر (۳۶۰)
لگے پاچ شہ خط زیبا سہائے
جگیں لال رخسارے مانک دو آئے (۳۶۱)
سہیں آنکھ دیدے سفیدی ملائے
جڑت جوت موتی میں لیلم نمائے (۳۶۲)
دسے ناک دیدور سوتر درمیاں
رہے مکھ او پر خوئے ہیروں کی کھان (۳۶۳)
کہیں لال مہندی نکھو پر دھرے
دسے جیوں سو گومید مانک جڑے (۳۶۵)

کتاب نورس کا گیت نمبر ۵۶ بھی اسی کی عکاسی کرتا ہے۔

در مقام کیدارا نورس

انترا

ایک کر دنڈی وادن دوجے پانڑی پستک پیکھت نورس گاوت اتپتی
کیسر وستر دسن سیام نکھ للائی مہری گئی پرتی

(ایک ہاتھ میں سام ہے دوسرے ہاتھ میں کتاب جس کو وہ دیکھتا ہے اور نورس کے گیت گاتا جاتا ہے۔ اس کا لباس زعفرانی ہے، دانت کالے اور ناخن پر مہندی لگی ہے، بڑا ہنر مند اور محبت کرنے والا ہے۔ (نورس ص ۱۳۱۔۱۳۲ مرتبہ نذیر احمد)

ابراہیم عادل شاہ خود ایک تخلیقی فنکار تھا اسی لئے اہل ہنر کی تربیت کرنا اولین فرض سمجھتا تھا اسکی سب سے بڑی خصوصیت کے بارے میں عبدل کہتا ہے۔

جکو آوجس کاج نس داد دے
مرم بات کا پونچھ دل ہاتھ لے

اہل ہنر کا وہ استاد تھا اور وہ اس کے شاگرد۔ اہل فن کا قدردان اور اہل فن اس کے پرستار، مجلسوں میں شریک ہوتا اور اپنی فنکارانہ بصیرت سے رہبری کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

عبدل کے ابراہیم نامہ کے شعر نمبر ۵۸۳ اور کتاب نورس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دکھنی میں بھی شاعری کرتا تھا۔ ایک اور تصنیف بدھ پرکاس کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

بیجا پور اور اس کا حصار:۔

بیجا پور یا بدیا پور نگر عادل شاہی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ ۱۵۶۶ء میں علی عادل شاہ اول (۱۵۸۰۔۱۵۵۲ء) نے اپنے دور میں محل اور شہر دونوں کے لئے پتھروں کے مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔ نئی ریاستوں کی تاسیس کے دوران قدرتی دفاع کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ لیکن شہر بیجا پور کے لئے ایسے کوئی قدرتی وسائل نہیں تھے، اطراف و اکناف میں نہ کوئی پہاڑ یا ندی تھی۔ عادل شاہی سلاطین کا یہ مرکز خالص میدانی علاقہ میں واقع تھا۔ راجدھانی یا پایہ تخت کی حفاظت کے لئے دفاعی اہمیت کے پیش نظر سنگین فصیل تعمیر کرنی پڑی، یہ ارک قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ علی عادل شاہ کے ورثاء نے محلات میں اضافہ کیا۔ ارک قلعہ یا شاہی فصیل کا قطر ایک میل ہے۔ یہاں جا بجا مضبوط برج بنے ہیں۔ قلعہ کی تعمیر کے لئے پتھر کی ضرورت تھی اسی جگہ سے پتھر نکالا گیا اور انہیں گڑھوں کو حصار کی حفاظت کے لئے آگے چل کر خندق بنا لئے گئے۔ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے تک شہر کی آبادی کافی بڑھ چکی تھی اور اس کی دفاع کے لئے ایک اور سنگین فصیل تعمیر کی گئی، جس کا قطر سوا چھ میل یا گیارہ کیلومیٹر ہے۔ فصیل کی دیوار ۲۴ فٹ چوڑی اور ۶۰ فٹ اونچی ہے، اس میں توپیں نصب کرنے کے لئے ۱۲۰ برج بنے ہیں، بندوقوں کے لئے چھ ہزار سوراخ، اس کے علاوہ ۷۰ چور سوراخ تھے جس میں سے دشمنوں پر گرم تیل انڈیل دیا جاتا تھا۔ قلعہ کے بلند و بالا دروازوں کے باہری حصہ پر ایک فٹ سے بھی زیادہ لمبے لوہے کے میخ لگائے گئے تھے تاکہ دشمن کے ہاتھی بھی دروازے نہ توڑ سکیں۔ قلعہ کے اطراف ۴۰ تا ۵۰ فٹ گہری اور چوڑی خندقیں بنائی گئیں تھیں انہیں پانی سے پر رکھا جاتا اور اس میں آبی درندے چھوڑ دئے جاتے تھے۔ ۱۵۶۶ء میں قلعہ کا کام شروع ہوا اور تین سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ ارک قلعہ میں آنند محل اور سات منزل یا سات کھن کے محلات ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کی تعمیرات ہیں۔ جس میں ابراہیم عادل شاہ مقیم تھا۔ شہر بیجا پور جو ریاست کا دارالسلطنت تھا اس دور میں ایک عظیم الشان اور متمول شہر تھا۔ شہر بلند و بالا سنگین مکانات سے پر تھا، جا بجا ہاتھی نظر آتے تھے اور جوہریوں کی دکانیں سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ بیش قیمت ہیرے جواہرات سے پٹے ہوئے تھے۔ شہر بڑا ہی پر فضا اور اس کی آب و ہوا صحتمند تھی۔ خاص بازار کی سڑکیں کشادہ تھیں اور ان کے کنارے دو رویہ سایہ دار درخت تھے۔ شہر کی دیگر دکانیں نوادرات سے بھری ہوتی تھیں۔ مشروبات، عطریات، فواکہات اور نانبائی کے دکانوں کی کثرت تھی۔ ان کے علاوہ رقص و سرود میں مگن رکھنے والے طائفے اور خوبصورت لڑکیوں اور حسیناؤں کی کمی نہیں تھی جو سج دھج کر بازاروں کی زینت بنا کرتی تھیں۔ یہ ساری باتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں شہر بیجا پور نہ صرف پر امن تھا بلکہ عوام و خواص چین کی بنسری بجایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں تمبا کو استعمال ہوتا تھا۔ یہاں سے یہ تمبا کو شمالی ہندوستان گیا۔ عبدل اس کی تفصیل یوں بیان کرتا ہے۔

عجب شہر دستا ارابا نگار

زمیں باہیا گل پدک کر سنگار
دسیں برج بچ بچ عجب یوں نمائے
جڑے پاچ الماس کے خرش لائے
وہیں شہر درمیاں کا کوٹ جان
دسے دوسرا دور درمیان بیان
ہوا مدھ سونا یک محل شاہ کا
کنڈل تارے ہور کھ سو گھر ماہ کا
دسے شہر میں کوٹ بچ شاہ گھر
محل چاند دولت کھلا کوٹ کر
دسے شہر ہر جنس معمور مانہہ
مگر بھشت کا عکس پڑیا چھانہہ
ہوا بخش ہر ٹھاؤں ماڈھیوں اوپر
نہ باقی شہریوں سو شاہوں کے گھر
گلے باہ کنٹھمال بازار ہار
پدک جوڑ مسجد سو درمیان ٹھار
زماناں عجب یو جنا پونگڑا
بدیا پورنگر روپ ہو کر کھڑیا

آج یہاں صرف کھنڈرات باقی ہیں، کسی زمانے میں بازار کی رونق اور چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ آج صرف اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس پس منظر میں اس زمانے میں یہاں کیسی رونق ہوا کرتی تھی اور کیسی چہل پہل تھی۔ اسی زمانے میں یوروپی سیاحوں اور شمالی ہند کے مغل سفیر اسد بیگ نے شہر بیجا پور دیکھا تھا، اور ان کی تفصیلات قلمبند کر لی تھیں وہی چیزیں دستاویزات کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مقامی شاعر نے جن تفصیلات کو قلم بند کیا ہے وہ سب سے بنیادی اور اہم بات ہے۔ اس زمانے کے بازاروں میں 'رتنوں کے ڈھگ' (آج بھی دکھنی میں ڈھگار کا لفظ ڈھیر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) یعنی قیمتی پتھروں کے ڈھیر لگے رہتے تھے جیسے یاقوت، فیروز نیلم وغیرہ جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس زمانے میں دولت کی فراوانی تھی۔ یہاں کی خوشبوؤں کی دکانیں کافی مشہور تھیں۔ یہ شہر عالموں فاضلوں، ہنرمندوں اور طوائفوں سے پر تھا، یہ رنگ روپ کا پرامن شہر تھا۔

اسی جنس سب روپ بدیا بھریاں
بدیا پورنگر میں بدیا رنسنگ کھڑیاں

نہ اس شہر میں نین آنجھو جھڑیں
سو بن میگھ دھاراں نہ ہو کچ پڑیں
نہ اس شہر میں کوئی دردوں ہنکار
سو بن پہنائے شہنائی نا کوئی پکار
نہ پڑتا شہر میں گو باندھیا نظر
سو بن موتیوں ہور پھولو کی لڑ

نہ اس شہر میں کوئی رگڑے کسے
سو بن زعفراں، مشک نا کچھ دسے
نہ اس شہر میں کوئی مارے کسے
سو بن گھاؤ منڈل نہ دوسرا دسے

نورس پور:۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے شہر کا نام بدل کر ودیاپور رکھا وہیں بیجاپور کے مغرب میں چار میل کے فاصلے پر ایک اور ذیلی شہر نورس پور کی بنیاد ۱۶۰۰۔۱۵۹۹ء رکھی۔ یہ شہر پانچ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ اس میں شاہی محلات، ذیلی مکانات اور حصار وغیرہ شہنواز خاں کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ یہاں بادشاہ نے اپنے لئے ایک خوبصورت محل تعمیر کروایا، جس کو سنہری اور ارغوانی رنگوں سے سجایا گیا۔ دربار کے سامنے سے بیجاپور تک ایک چوڑی سڑک بنوائی جس کے دونوں طرف دومنزلہ دکانیں اور بیچ میں مانک چوک تھا اس کے چاروں طرف سے سڑکیں نکال کر دکانیں بنوائی گئیں۔ شہر کا نام نورس پور تھا اور یہاں کا شاہی محل ’نورس محل کہلاتا تھا۔ اس کو سنگیت محل بھی کہا جاتا تھا۔ خود ابراہیم عادل شاہ نے بھی کتاب نورس میں نورس پور کا تذکرہ کیا ہے۔

ابراہیم آکھیں یو کو یت نورس‘ نورس پور گن نگر

ظہوری نے نثر سوم میں اس شہر کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ عبدل نے اپنے انداز سے ’درتعریف نورس محل حضرت شاہ کے عنوان سے چند شعر کہے ہیں

سنواب صفت شاہ محل رہن ٹھاؤں
دھریا ناؤں نورس محل تس جو یاؤں
وے محل نورس دھریا ناؤں یوں
بھریا رنگ نورس نت آٹھ روپ جیوں
وے محل نورس ہوا یوں اٹھان
دسے گگن آ گن ہوا سکا نشان
گگن سات سیڑھی ہو مل جوڑ کر
نہ لگ محل نورس کے ایک کھن اوپر

۱۶۵۰ء میں فزونی استر آبادی نے ہندوستان کی سیاحت کی بیجاپور بھی گیا، اس وقت وہ کھنڈر بن چکا تھا۔ ان کھنڈرات سے متاثر ہو کر اس نے لکھا ہے کہ ان کھنڈروں میں شاہی محل بھی ہے جس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ اس نے ان عمارتوں کا مقابلہ آگرہ، دہلی اور لاہور کی عمارتوں سے کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ نورس پور کے محلات دیگر مذکورہ محلات سے برتر ہیں۔

ابراہیم کالاؤلشکر:۔

تواریخ ابراہیم کے رزمیہ کارناموں سے پر ہیں۔ دلاور خاں کے بعد قطب شاہوں سے جو زور آزمائی ہوئی وہ بیجاپور کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ دربار کی شان و شوکت، لاؤلشکر (جس میں باون ہزار سوار، ایک لاکھ احشام اور نوسو پچپن فیل بتائی جاتی ہے)۔ عبدل نے بھی اس کے لاؤلشکر کے بارے میں شعر کہے ہیں۔

کھڑے بہت اسپت، گجپت راؤ
کہ نرپت کہتیں نہ کچھ گنت آؤ
کھڑے مست جھولے تو ہستی اپار
گگن شاہ دہلیز تل جیوں پہار

ان ہاتھیوں کی ’کڑ گرات‘ ان کے ’اجل دنت‘، ہر قسم و ہر ملک کے گھوڑے، اونٹوں کی قطاریں، سلحداروں کا ہجوم یہ ساری چیزیں ابراہیم عادل شاہ کی شان و شوکت اور عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور کم و بیش یہی تفصیل ظہوری کی سہ نثر میں ملتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ شکار کا شوقین تھا۔ عبدل نے 'درتعریف رفتن شکار' میں اس کی تفصیل دی ہے۔ جب وہ شکار کو نکلتا دمامیوں کے آوازوں سے زمین دہل جاتی، نشان گرج اٹھتے، یوں کہئیے کہ ان گرجدار آوازوں سے زمین و آسمان تھرا جاتے۔ دریا اور سمندروں میں طلاطم پیدا ہو جاتا۔ عبدل نے اس ہیبت ناک آوازوں کے نتائج کا بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ زمین ان آوازوں سے جیسے ہی تھرا اٹھتی تو اس کا لہو پانی بن کر چاروں طرف بکھر جاتا، درختوں کی شاخیں بالوں کی طرح بکھر جاتیں اور زمین کے رونگٹے گھاس بن کر اس کے تن پر کھڑے ہو جاتے۔

بکھر بال تن جھاڑ ہر اک دھر
کھڑے رونگٹے گھاس سب آنگ بھر

ادبی اہمیت :۔

عبدل کا ابراہیم نامہ ادبی اعتبار سے اس لئے اہم ہے کہ اس نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کا بزمیہ مثنوی کی شکل میں قصیدہ لکھا۔ جس میں اپنے ممدوح کی حسن وصورت وسیرت، شہر بیجاپور، نورس پور اور انکی شان وشوکت وعظمت اور اس کی ادب وفن نوازی کی تفصیل ملتی ہے۔ عبدل نے تاریخی حقیقت کو افسانوی طور پر پیش کیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شخصیت، اس کا دربار، اس کے رزم و بزم وغیرہ تاریخی حقائق ہیں، جنہیں عبدل نے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ جہاں تک تخیل کی بات ہے وہ بھی اس مثنوی میں ملتی ہے مثلاً اس مثنوی کے آخری حصہ میں 'بسنت راؤ (شاہ بہار) کا تذکرہ ہے وہ خالص تخیل کا حصہ ہے جس میں میزبانی کے جشن میں وہ ساری باتیں جو ابراہیم کے دربار میں دیکھی تھیں شعری جامہ پہنا کر بیان کیا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے جب عبدل سے یہ فرمائش کی کہ وہ اس زبان میں مثنوی لکھے تو اس کے سامنے کئی ایک مسائل کھڑے ہوئے کیونکہ وہ عرب وعجم کی زبان اور اسلوب سے واقف نہیں ہے۔ اس کے سامنے باکمالوں کا کوئی نمونہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنی بات کو اسی طرز میں پیش کر سکے۔ اس کو اپنا راستہ خود تلاش کرنا تھا، اسی لئے یہ تذبذب نظر آتا ہے کہ وہ کس زبان میں شعر کہے۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے جب اس کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنے بادشاہ جگت گرو کا چیلا نظر آتا ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ عقل اور بچن کے باہمی ربط کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جو اس کے تنقیدی شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عبدل کے خیال میں شعر شعور سے بنتا ہے اور شعور کا ماخذ 'بچن' ہے۔

بچن بچ ہے عقل کی مول کا
بچن باس ہے عقل کے پھول کا

اسی سے تمام فنون کی تخلیق ہوتی ہے، اسی سے ازل اور ابد کی طنابیں ملتی ہیں اور ترلوک جنم لیتے ہیں۔ جوہری کی طرح شاعر شعر کا پاریکھ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بچن کا گیان ضروری ہے۔ بچن اور ارتھ کے تعلق کو اس نے بڑی اچھی تشبیہ سے سمجھایا ہے۔ بچن کو وہ درخت سے اور ارتھ کو پھل سے تشبیہ دیتا ہے۔ لفظ ہمیشہ معنوں سے پر ہونا چاہئے جیسے انار بیجوں سے ہوتا ہے۔

توں کر حرف جھاڑ وکو سب باردار
بھرے خوب معنی سو پھل آشکار
توں بھر بیچ معنی سو جیوں بیچ انار
حرف بول تھوڑے، آرتھ بے شمار (۱۴۳۔۱۴۴)

عبدل کے کلام میں فصاحت، بلاغت، نزاکت خیال، سلاست اور روانی کی شدت سے کمی محسوس کی جاتی ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے اسلوب پر ہندی کے گہرے اثرات ہیں۔ مثلاً عبدل سے قبل برہان الدین جانم کی مثنوی ارشاد نامہ صوفیانہ اصطلاحات سے پر ہے تو ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس موسیقی کی اصطلاحات سے پر ہے۔ بعد کے آنے والے شعراء نے اس میں ایک نیا موڑ لایا۔ مثلاً صنعتی بیجاپوری 'قصہ بے نظیر' (۱۰۵۵/۱۶۵۰) نے اپنی زبان کو سنسکرت کے اثر سے نکال کر دکھنی کی موڑ دیا۔ جس کے باعث بیجاپور کی زبان اور اسلوب میں بہت بڑی تبدیلی آتی ہے۔ عبدل کا ابراہیم نامہ اسلوب کے اعتبار سے شعر میں اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔ اس کے کلام میں سلاست وروانی، فصاحت وبلاغت کے مقابلے میں خیال آرائی اور تخیل ہے۔ آمد کے بجائے آورد ہے مثنوی کی شکل میں قصیدہ ہے، لیکن ان کی خصوصیات سے بالکل معرّیٰ۔ صنعت گری میں زور، تشبیہ استعارہ اور تمثیل سے پرُ۔ اس کی مثال میں ہم بسنت راؤ کو متشکل دیکھ سکتے ہیں جو

خالص تمثیلی پیرایہ میں پایا جاتا ہے۔ عبدل کے ہاں رقاصاؤں کے حسن وشباب میں لذتیت پائی جاتی ہے جو بادشاہ کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ عبدل کے اسلوب شعری میں سب سے بڑی کشش اس کی قوت بیان، نادر تشبیہات، ہندو دیو مالا کی تلمیحات ہیں مثلاً نورس محل کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

کہ یارات، دن کے دومز دور دھر
نورس محل کا کام بنیاد کر
لیا گگن کا ٹوکرا دیس سر
سورج اینٹ مانک سودھر چرخ بھر
نت اٹھ دو ہوے سو (دو) دریا منجھار
چووے نیر پرگٹ ہو کرنا کی دھار
یہیں رات بھی سیس آپن دھرے
گلا وا موتیوں چاند چونا کرے
کلا ٹوکرا بھی جوسٹ لیائے کر
پڑیاں اچھل چھیٹا ہو تارے بکھر

اور یہی تمثیلی انداز ''در تعریف مجلس حضرت شاہ عالم پناہ'' و ''در تعریف کہ شب گذشتہ و روز خود آراستہ کردہ بہ مجلس شاہ آمد'' میں ملتا ہے آمد صبح کو استعارہ اور کنایہ کی زبان میں یوں لکھتا ہے۔

اڑی رات کو بل گگن بن اوپر
نکل دیس کا باز سچ صبح پر
پکڑ سُرج چنگل سوں نکھ ِکرن رات
دسیا لال لو ہو شفق گگن دھات (۴۱۰۔۴۰۹)

مجموعی طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عبدل اپنے اسلوب کا بانی ہے۔ اس نے جس صناعی کا مظاہرہ کیا ہے قدیم ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مثنوی کی بحر فعولن فعولن فعولن فعول کے استعمال کے باوجود سلاست اور روانی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مبالغہ اور غلو کا کثرت استعمال وغیرہ عیوب اس لئے دکھائی دے رہے ہیں کہ عبدل کو ایک نئی زبان میں لکھنا پڑا جو ادبی اعتبار سے اپنے فن میں پختگی نہیں پیدا کر سکی تھی اور عبدل ہے کہ اس میں شاہ نامہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم عبدل کی حیثیت صرف تاریخی نہیں بلکہ وہ ایک ابتدائی اہم شعری کارنامہ ہے، جو اپچی بھی ہے، کسی کا ترجمہ یا کسی کا رہین منت نہیں۔ اور یہ بیانیہ اور تمثیلی شاعری کے اسلوب کا ماخذ بھی ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نصرتی جیسے شاعر نے اپنے شاہ نامہ (علی نامہ) کی بنیاد اسی پر رکھی ہوگی اگر چہ اس سے قبل عبدل نے اس کے لئے راہ ہموار کر دی تھی۔ لیکن نصرتی اپنے کلام میں کسی پیش رو کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال کا دم بھرتا ہے۔

کرناٹک اردو اکادمی کا یہ مستحسن اقدام ہے کہ اس شاہکار فن پارہ کے دوسرے ایڈیشن کو بڑی آب و تاب اور خوبصورتی سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس میں تاریخی تصاویر کو دیکھتے ہیں۔ سنہ ۲۰۱۳ میں بیجاپور کے ایک سرکاری ادارہ عادل انواد نے بیجاپور کے تاریخی ماخذ کو کھنگال کر اس کا ترجمہ علاقائی زبان کنڑا میں ترجمہ کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس پراجکٹ میں فارسی اور دکھنی کے مخطوطات و مطبوعات کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ ابراہیم نامہ بھی اس میں شامل ہے۔ کنڑا زبان میں اس کے ترجمے سے کنڑیگاؤں تک یہ بات محدود رہ جاتی، اسی لئے اس کو اب اردو اور انگریزی زبان میں بھی شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ تاکہ عادل شاہی دور کی مکمل تاریخ ساری دنیا کے سامنے آ سکے۔